نیاز صاحب

رئیس احمد جعفری

نیاز صاحب کی وفات اب "باسی خبر" ہو چکی ہے۔ لیکن میرے لیے وہ اب تک ایک سانحہ ہے سچ تو یہ ہے کہ ان کی وفات سے جو صدمہ مجھے پہنچا تھا، وہ ابھی تک تازہ ہے۔ اور شاید بہت دنوں تک تازہ ہی رہے گا۔

نیاز صاحب کی شخصیت ہمیشہ متنازعہ رہی..... انھوں نے ناول لکھے لیکن ناولوں کے نقاد کہتے ہیں "تکنیک" کے اعتبار سے وہ کچھ یوں ہی تھے، انھوں نے افسانے لکھے لیکن افسانوں پر تبصرہ کرنے والوں نے انھیں اچھا افسانہ نگار تسلیم کرنے سے مقدور بھر گریز ہی کیا۔ انھوں نے نقد الشعراء پر اپنے قلم کے جوہر دکھائے۔ لیکن ایک معقول جماعت انھیں شعر و سخن کا نقاد ماننے سے انکار کرتی رہی، ادبیات عالیہ میں وہ ایک طرز خاص کے موجد تھے، لیکن یہ طرز خاص اسکولوں اور کالجوں کے طلبا کے سوا کہیں اور مقبول نہ ہو سکا، اور بازار ادب میں اسے کھوٹا سکہ ثابت کرنے کی پوری کوشش کی گئی، ان کی متعدد تصنیفات پر الزام لگایا گیا کہ ناقص اور نامکمل ترجمے ہیں اور ان کے متعدد ترجموں کے بارے میں کہا گیا ہے کہ ہاں ہیں۔ باب الاستفسار کے عنوان کے ماتحت ہر مہینے میں وہ گراں بہا معلومات سے اپنے ناظرین کو روشناس کرتے رہتے تھے، لیکن نقادوں نے اس اچھوتے، دلچسپ اور مفید عنوان کو بھی معاف نہیں کیا، اور اسے انسائیکلو پیڈیا اور دوسری کتابوں سے ماخوذ قرار دیا، مکاتیب نیاز کا سلسلہ بھی نگار میں جاری رہا۔ لیکن لوگوں نے کہا۔ غالب اور شبلی کے بعد کسی کو اپنے خط چھپوانے کا حق کیا ہے؟ انھوں نے اسلامیات اور مذہبیات پر طوفان خیز

اور بعض اشتعال انگیز مضامین لکھے اور لکھوائے، یعنی خود بھی تحقیق کی، اور دوسروں کے تحقیقی مقالات بھی شائع کئے۔ انھوں نے مذہب کے بہت سے مسلمات کا انکار کیا اور اس سلسلے میں عوامی تعزیر و عقوبت سے بھی دوچار ہوئے، توبہ بھی کی اور توبہ شکنی بھی کی، ظاہر ہے، ان رندانہ جرأتوں کا ردِّ عمل مذہبی حلقوں میں بہت شدید ہوا۔ مخالفانہ جلوس نکلے، جلسے ہوئے، بائیکاٹ کیا گیا، گھر سے باہر نکلنا، اور گھر میں چین سے بیٹھنا دوبھر کر دیا گیا۔ یہ سب کڑیاں وہ جھیلتے رہے، اور حکمت عملی سے کام لے کر ان سے عہدہ برآ ہوتے رہے، ان کے سیاسی افکار بھی، رائے عامہ کے مخالف اور متصادم ہی رہے، عملی سیاست میں انھوں نے کبھی حصہ نہیں لیا۔ نظری سیاست میں وہ "نیشنلسٹ" ہی رہے اور اپنے نیشنلزم پر فخر کرتے رہے، لیکن ان کی سیاسی فکر ہمیشہ سمجھوتے کی طرف مائل رہی۔ بھوپال جیسی مطلق العنان ریاست میں وہ برس ہا برس تک ملازم رہے، لیکن ارباب حکومت کو کبھی ان سے شکایت کا موقعہ نہیں ملا۔ رام پور اور حیدر آباد جیسی ریاستوں کے مطلق العنان فرماں رواؤں کی انھوں نے مدح بھی کی اور صلہ بھی لیا۔ ساتھ ہی ساتھ برطانوی ہند میں وہ کانگریس کا فکری طور پر ساتھ دیتے رہے۔ اور حق انفرادیت کو لایعنی اور سہل قرار دیتے رہے، چنانچہ ۱۹۴۷ء کے پُرآشوب دور میں بھی نہ صرف ان کی پگڑی سلامت رہی بلکہ چند سال بعد بھارت کی حکومت نے انھیں سب سے بڑا ادبی خطاب مرحمت کیا۔ پھر بعض مخصوص حالات کے ماتحت وہ پاکستان آ گئے۔ یہاں آ کر انھوں نے جو پالیسی اختیار کی، وہ ظاہر ہے پہلی سے بالکل مختلف تھی، ان کے یہ تغیرات ہر ملک کی بزم سیاست میں موضوع بحث بنے رہے۔ موافق کم مخالف زیادہ!

یہ مختصر سا جائزہ اس اندازے کے لیے کافی ہے کہ ہر دور میں نیاز صاحب ارباب سیاست، ارباب ادب، ارباب شعر و سخن اور اصحاب مذہب کے لیے ایک حل طلب مسئلہ بنے رہے، اور اس موضوع پر متعدد اصحاب نے کافی جوش و خروش سے وقتاً فوقتاً طبع آزمائیاں بھی کیں۔

میں اس موضوع پر جو تلخ بھی ہے اور بعد از وقت بھی گفتگو کرنا نہیں چاہتا، کیا فائدہ

ان باتوں سے ؛ البتہ مجھ پر ان کی شخصیت کا جو اثر ہے، اسے بیان کئے بغیر بھی نہیں رہ سکتا، میرا یہ عقیدہ ہے کہ فکری اور عملی اور نظری اعتبار سے کوئی انسان کتنا ہی "گمراہ" کیوں نہ ہو لیکن اگر وہ اچھا انسان ہے تو قابلِ احترام ہے اور بارگاہِ الٰہی میں بھی سزاوارِ لطف و کرم ہے۔ اور بلاشبہ نیاز صاحب نہ صرف اچھے انسان تھے بلکہ بہت اچھے انسان تھے۔

آزادیٔ ہند کے بعد میرا ارادہ ترکِ وطن کا نہیں تھا، لیکن بمبئی سرکار نے مجھے شرفِ مہاجرت عطا کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس زمانے میں مولانا ابوالکلام آزاد کی صدارت میں انجمن اتحاد و ترقی کا ایک جلسہ لکھنؤ میں منعقد ہوا۔ اس انجمن کے سرگرم کارفرماؤں میں نیاز صاحب بھی تھے۔ انھیں جب میرے حالات کا علم ہوا تو فوراً انھوں نے خط لکھا:۔

"انجمن اتحاد و ترقی کی طرف سے ایک اُردو روزنامہ شائع کرنے کا پروگرام بن چکا ہے بمبئی چھوڑیئے اور لکھنؤ آجایئے کرسی ادارت آپ کے لیے خالی ہے"۔

مجھ میں اور نیاز صاحب میں فکری اتحاد ہوتا جب بھی اس نازک مرحلے پر یہ پیش کش معمولی نہیں تھی، لیکن کمال تو یہ ہے کہ نیاز صاحب جانتے تھے، میں کٹر مسلم لیگی اور پاکستانی رہا ہوں، پھر بھی اپنی ذمہ داری پر اپنے رفقاء کو آمادہ کر لینا کہ ایسے "خطرناک" آدمی کو ایڈیٹر بنا دیا جائے، عالی ظرفی کی انتہا تھی، یہ الگ بات ہے کہ میں اس پیشکش کو قبول نہ کر سکا، اور پاکستان آگیا۔

ایک مرتبہ نیاز صاحب لکھنؤ سے براہِ راست لاہور آئے۔ نقوش کے ایڈیٹر طفیل صاحب بڑے ندرت پسند شخص ہیں۔ انھوں نے نیاز صاحب سے اصرار کیا کہ لاہور میں سب سے پہلے ان کی دعوت قبول کریں۔ اور پارٹی میں شریک ہوں، نیاز صاحب نے دعوت قبول کر لی، دعوت نامہ جس طرح دوسروں کو گیا تھا، میرے پاس بھی آیا۔ اور ٹھیک دعوت کے دن طفیل صاحب غریب خانے پر تشریف لائے۔ اور کہنے لگے، آج کی پارٹی میں آپ کو ضرور شریک ہونا ہے، میں دعوہ لینے آیا ہوں، میں نے کہا، دعوت نامہ پہنچ گیا تھا، آپ کو تکلیف کرنے کی کیا ضرورت تھی کہنے لگے۔

"نیاز صاحب کا اصرار ہے کہ اس موقع پر رئیس کو ضرور ہونا چاہیئے!"

میں یہ سُن کر حیران رہ گیا، بھارت میں تھا تو کبھی کبھی خط و کتابت بھی ہو جاتی تھی، اب کئی سال سے نامہ و پیام بند تھا، مگر انھوں نے ان تعلقات کو فراموش نہیں کیا، جو ذاتی طور پر اور خاندانی طور پر ان سے چلے آ رہے تھے۔

نیاز صاحب مستقل طور پر کراچی آ گئے تو کراچی میں سکونت اختیار کر لی، وہیں سے نگار نکلنے لگا۔ اس کئی سال کی مُدّت میں ایک دفعہ سے زیادہ ملاقات کا ارادہ آیندہ پر ٹلتا رہا۔ کینسر میں مبتلا ہونے سے پہلے، ان کا ایک کارڈ میرے پاس آیا۔

"آپ کراچی آتے ہیں، اور مجھ سے ملے بغیر چلے جاتے ہیں ؎

ساقی یہ تری کم نگہی یاد رہے گی

گھڑوں پانی پڑ گیا، فوراً معذرت نامہ لکھا، اور وعدہ کیا کہ اب کے کراچی آیا تو ضرور حاضر خدمت ہوں گا۔ لیکن بدقسمتی کہ یہ وعدہ پورا نہ ہو سکا، اور آخر وہ اس دنیا سے رخصت ہو گئے اپنایت کا یہ عالم تھا کہ جب وہ خط لکھتے "عقیل" یعنی میرے بڑے بھائی اور والدہ کی خیریت دریافت کرتے، ان کی وفات سے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ایک بہت اچھا انسان بھی وفات پا گیا۔ اور ایک بہت اچھا بزرگ بھی۔ انا للہ و انا الیہ راجعون ط